سوانحِ داغ-چندحقایق

ڈاکٹر طارق ہاشمی

ABSTRACT:
Mirza Dagh Dahalvi is one of the most important poets of Urdu literature especially of Mughal and colonial period. His poetry is a symbolic revolt against the imperial power of that time i.e. the Great Britain. In this brief article, the important aspects of the life of Dagh Dahalvi have been highlighted.

دباؤ کیا ہے سنے وہ جو آپ کی باتیں
رئیس زادہ ہے داغ ، آپ کا غلام نہیں (۱(

داغ کا یہ شعر محض خاندانی تفاخر کا اظہار نہیں بلکہ غلامانہ ذہنیتوں پر طنز بھی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے تمام تر نشیب و فراز کے باوجود زندگی کو نشاطیہ اسلوب میں دیکھنے اور مسرت آمیز انداز میں گزارنے کے قائل تھے۔ اُن کی زندگی میں کڑے امتحان کے پہلو بھی آئے مگر خدا نے انھیں اپنے مزاج کے مطابق حیات کرنے کے مواقع بھی عطا کیے۔

وہ ایک خود اعتماد اور اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرنے والے تھے لیکن یہ امر افسوس ناک ہے کہ نوآبادیاتی عہد کی غلامانہ ذہنیتیں اُن کے اس اعتماد کی شاکی دکھائی دیتی ہیں ۔ ممکن ہے خود بدیسی آقاؤں نے بھی داغ کے خلاف افواہ خیزیوں میں کوئی کردار ادا کیا ہو لیکن بعض عصری رویے بھی اس نوع کے رہے کہ داغ کے بارے میں حقائق کو دھندلانے میں ایک بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

یہ تلخ حقیقت ہے کہ داغ کے اردگرد دشنام طرازیوں کا ہالہ بہت ہی وسیع ہے۔ اُن کی شخصیت اور شاعری سے لے کر سوانحی کوائف تک بہت سے معاملات پر رسوائیوں کی گہری تہ جما دی گئی ہے۔ خصوصاً اُن کی سوانح کو بعض محققین نے ایک خاص زاویے سے دیکھا ہے اور قیاسات پر مبنی بعض ایسے نتائج اخذ کیے ہیں جس سے داغ کا خاندانی پس منظر بہت گدلا دکھائی دیتا ہے۔

داغ کی والدہ وزیر بیگم المعروف چھوٹی بیگم دلی کے ایک سادہ کار محمد یوسف کاشمیری کی تیسری بیٹی تھیں ۔ بقول تمکین کاظمی:

''چھوٹی لڑکی وزیر بیگم شمس الدین خان سے وابستہ ہوئیں ۔''(۲(

یہ وابستگی کس نوعیت کی تھی۔ اس بارے میں بہت سے شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔ مالک رام نے تو اس بارے میں میر شمس الدین کے نکاح ناموں تک بھی رسائی حاصل کی اور چھوٹی بیگم کے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کیا:

''یہ ہرگز اُن کی منکوحہ بیوی نہیں تھیں ۔ نواب شمس الدین کی صرف دو بیویاں تھیں (اور میں نے اُن کے نکاح نامے دیکھے ہیں)۔ چھوٹی بیگم اُن کی بیوی نہیں تھیں ۔''(۳(

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اُردو میں عبدالغفور نساخ کے تذکرے کی روشنی میں اپنی ''تحقیق'' کو بڑے لطف لے کے بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں :

''چھوٹی بیگم محمد یوسف کشمیری کی حسین و جمیل بیٹی اور والی فیروز پور جھرکہ نواب شمس الدین خاں کی داشتہ تھیں ۔ خود نواب شمس الدین احمد خان نواب احمد بخش کی داشتہ مدی نامی میواتن کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ جس سے بعد میں احمد بخش خاں نے نکاح کر کے اُس کی اولاد کو ورثے میں شامل کر لیا تھا۔''(۴(

نواب شمس الدین کی پھانسی کے بعد چھوٹی بیگم انگریز سرکار کے خوف سے روپو ش ہوگئیں اور اپنے اثاثہ جات کی وراثت کے بارے میں کوئی قانونی چارہ جوئی نہ کر سکی تھیں جس سے اس خیال کو اور تقویت ملی کہ وہ نواب صاحب کی منکوحہ نہیں تھیں ۔

کلیاتِ داغ کے ایک مرتب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے واضح طور پر لکھا کہ وزیر بیگم:

ـ''نواب شمس الدین والی لوہارو و فیروز پور جھرکہ سے وابستہ ہوئی۔ یہاں بھی بے نکاحی بیوی کی حیثیت سے تقریباً پانچ سال رہی۔''(۵(

لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے ہی دیباچے کے اختتام پر شمس الرحمن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں '' میں پیش کردہ بعض افسانوی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے نہایت معذرت خواہانہ لہجے میں اپنے ہی دعوے کی تردید کر دی اور اسے ایک غلط فہمی قرار دیا۔

بعض محققین نے اس سے بھی آگے کے دعوے کیے ہیں جن کی بنیاد والدین اور اولاد میں جسمانی رنگ میں اختلاف کو بنیاد بناتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا کہ داغ ایسا سیاہی مائل رنگ والا شخص ایک سرخ و سفید نواب کی اولاد نہیں ہو سکتا۔

داغ، نواب شمس الدین خان کی اولاد نہیں تھے یا بے نکاحی اولاد تھے، ایسے دعوے قیاسِ ظن سے زیادہ نہیں اور اب یہ سوال بذاتِ خود تحقیق طلب ہیں کہ یہ قیاس کیوں کیے گئے اور پھر اُنھیں سنجیدہ تحقیق کا حصہ بنانے کی کوشش کرنے کے پیچھے کیا محرکات ہیں ۔

یہ امرِ حیرت ہے کہ داغ کے خاندانی پس منظر کو راست انداز میں دیکھنے کے بجائے قیاسات پر مفروضے کیے گئے اور پھر انھی پر یقین کر لیا گیا اور یہ نہیں سوچا گیا کہ داغ نواب شمس الدین کی واحد اولادِ نرینہ تھے اور اُن کی پھانسی کی بنیاد دراصل ریاست اور ملکیت کا جھگڑا تھا۔ نیز انھیں جس شخص کے قتل کے الزام میں سزائے موت ہوئی وہ ایک انگریز ریزیڈنٹ تھا۔ چنانچہ نواب شمس الدین کو نہ صرف پھانسی دی گئی بلکہ اُن کی واحد نرینہ اولاد کو وراثت کے حقوق سے بھی محروم کیا گیا اور کارروائی میں بدیسی آقاؤں کے ساتھ ساتھ اُن کے چچاؤں امین الدین خاں اور ضیاء الدین احمد خاں نے بھی برابر کا حصہ شامل کیا اور اس کا آسان ترین حل یہی تھا کہ داغ کی ولدیت ہی کو مشکوک کر دیا جائے تاکہ وراثت کا قصہ ہی ختم ہو جائے۔

معلوم نہیں یہ شوشہ پہلی بار کس نے چھوڑا لیکن اِسے عام کرنے میں اپنے وقت کے انتہائی غیر سنجیدہ مجلے ''اودھ پنچ'' نے بھرپور ادا کیا اور داغ پر دشنام طرازی کا کوئی موقع ضائع کیا نہ کوئی دقیقہ فروگذاشت کیا۔داغ دہلوی امیر مینائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

''آپ کا ارشاد بہت بجا ہے کہ کوئی روکنے ٹوکنے ولا انظر نہیں آتا، مگر یہ بھی خیال رہے کہ جو ذربات لکھنؤ کی یہاں جمع ہیں ، مجھ پر چھری تیز کیے ہوئے ہیں ۔ یہیں پر کیا منحصر ہے تمام ہندوستان مخالف ہے۔ سنتا ہوں کہ آزاد لکھنؤ اور سحنۂ ہندمیرٹھ یا مالک مجھ پر یا میرے شاگردوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں ۔ لوگ بغیر اطلاع کے جواب دے رہے ہیں ۔ اعتراض بھی لغو اور جواب بھی پوچھیہ امور خلل اندازِ روزگار اور مانع اعتبار نہیں ہو سکتے، نہ ایسے حاسد فروغ پا سکتے ہیں ۔ داغ کا سکہ جس کے دل پر بیٹھا وہ مٹ نہیں سکتا۔''(۶(

یہ امر قابل ذکر ہے کہ شمس الدین خاں کو پھانسی دینے کے لیے نہ صرف انگریزی قوانین میں ترمیم تجویز کی گئی بلکہ مسلمان علما سے بھی ایک ذمی کے قتل کے قصاص کے سلسلے میں باقاعدہ فتوے لیے گئے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

''مولوی رشید الدین کے مکاتیب کا جو قلمی مجموعہ میرے کتب خانے میں ہے اس کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایجنسی کے دفتر انشاء نے ایک تحریرطیار کی تھی جس میں کتب فقہ کی وہ تصریحات نقل کر دی تھیں جو ذمی کے قصاص کے بارے میں ہیں اور صورت یہ بتائی تھی کہ فریزر ذمیوں میں داخل تھے اس کے مسلم قاتل اور محرک قتل سے قصاص لینا واجب ہے، بادشاہ نے بڑی کوشش کر کے بعض علماء کو جو قلعہ سے وابستہ تھے اس پر آمادہ کیا کہ اس تحریر پر دستخط کر دیں اور اسی محضر کی بنا پر خود بھی ایک شقہ لکھ کر ایجنٹ کے حوالے کر دیا، یہ شقہ اور محضر تمام ملک میں شائع کیا گیا اور ریزیڈنٹوں اور پولیٹیکل ایجنٹوں کے ذریعے تمام ریاستوں کے درباروں میں پہنچایا گیا تھا۔''(۷(

نواب شمس الدین خان کی پھانسی کے وقت داغ کی عمر ۴ سال اور چند ماہ تھی۔ داغ کو پہلی اپنی خالہ عمدہ بیگم کے حوالے کر دیا گیا چھوٹی بیگم دربدر ہو گئیں ۔ تمکین کاظمی داغ کا بیان نقل کرتے ہیں :-

''داغ بیان کرتے تھے کہ اُن کے والد شمس الدین خاں نے بڑی تفصیلی وصیت نامہ چھوڑاتھا جس میں اُن کے اور اُن کی والدہ کے نام جائیداد اور نقد و جنس کی وصیت کی تھی مگر یہ وصیت نامہ انگریزوں نے غائب کر دیا اور کوئی چیز انھیں یا اُن کی والدہ کو نہ مل سکی۔ صرف ایک مکان جس میں اُن کی ولادت ہوئی تھی جو اُن کی والدہ کے نام خریدا گیا تھا، اُن لوگوں کو ملا اور کچھ نہ مل سکا۔''(۸(

شمس الدین خاں کی پھانسی کے وقت انگریزوں نے اس گھر کی تلاشی بھی لی۔ چھوٹی بیگم انگریزوں کے خوف سے روپوش ہو گئی اور پھر در در کی ٹھوکریں کھانے لگیں ۔ آٹھ نو برس کی گردش کے بعد چھوٹی بیگم نے ولی عہد سلطنت مرزا فخر و سے نکاح کر کے قلعہ پہنچ گئیں اور بعدازاں اس داغ کو بھی وہیں بلوالیا۔

قلعے میں قیام کے دوران میں چھوٹی بیگم شوکت محل کے لقب سے نوازی گئیں اور داغ کو فنِ سپیہ گری و شاعری میں کمال حاصل ہوا۔ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۵۶ء تک کا یہ دور ماں ، بیٹے دونوں کے لیے سکھ چین کا عرصہ تھامگر گردشِ تقدیر نے پھر اپنا اثر دکھایا اور مرزا فخرو ۳ نومبر ۱۸۵۶ء کو انتقال کر گئے۔ اُن کی وجہ مرگ بھی محلاتی سازش تھی کہ ملکہ زینت محل کو اُن کو ولی عہدی پر سخت اختلاف تھا۔ چنانچہ پہلے انگریز ریزیڈنٹ سرٹامس مٹکاف کو زہر کہلوایا اور بعد ازاں مرزا فخرو کو اس حربے سے مروا دیا مگر یہ مشہور ہو گیا کہ ولی عہد کو ہیضہ ہوا۔

دا غ دہلوی کو اس کا بہت صدمہ ہوا اور انھوں نے اس حادثے پر یوں تاریخ رقم کی:

غمِ فتح ملک سلطاں ، چہ بلائے جان و دل شد
دَہدَش مقامِ جنت نہ کرم کریم غفار
چو زِداغ سالِ رحلت دلِ درد مند پرسد
بکشیدہ آہِ حسرت دو صدو دواز دہ بار

مرزا فخرو کے انتقال کے بعد انھیں قلعہ سے تو نکلنا پڑا لیکن اُن کا قیام دلی ہی میں رہا اور نہایت کسمپرسی کے دن گزارے۔ اس سے قبل نہ اُن کو فکر معاش تھی اور کسی ذمہ داری کا بارِ گراں ، مگر اب صورتِ حال اس سے قطعی مختلف تھی:

وہ میں کہ میسر تھا مجھے ساغرِ جمشید
پیتا ہوں تو کرتا ہے کمی خونِ جگر آج
وہ میں کہ مرا قصر ہر اک رشکِ ارم تھا
بستر ہے گدایانہ سرِ راہ گزر آج

وہ میں کہ مجھے سیرِ گلستاں سے غرض تھی
ہے خونِ جگر اور امرا دیدۂ تر آج
سامان تھا دنیا بھی مرے واسطے موجود
دنیا سے گزرنے کا نہیں زادِ سفر آج (۹(

داغ ممکن ہے اپنی اس کسمپرسی کا کوئی حل بھی نکالتے مگر شومئ قسمت کہ جنگِ آزادی شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں بہادر شاہ ظفر معزول کر دیے گئے۔ مغلوں کے نظام سلطنت کی بیخ کنی ہو گئی۔ انگریزوں نے انتقام کی آگ میں شاہی خاندان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے عام افراد کو بھی ہیں بخشا۔ قتل و غارت گری کا ایک وسیع تر سلسلہ شروع ہو گیا اور اُس میں مردوزن اور پیرو جواں کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بس سولیاں لہراتی تھیں اور توپیں گرجتی تھیں ۔

''اس صورتِ حال کا داغ نے خود مشاہدہ کیا اور یہ واقعہ خونیں اُن کی آنکھوں کے سامنے گزرتا رہا۔''(۱۰(

داغ نے ان واقعات کو محض دیکھا نہیں بلکہ اُن کے دلِ حساس نے گہرا اثر بھی قبول کیا اور اس حادثے پر سو سو طرح سے روئے۔ بقول سبط حسن:

''اپنی تمام تر راحت طلبیوں کے باوجود اُن کے حساس دل نے اِسی حادثے جاں کاہ سے بہت گہرا اثر لیا۔ وہ جہان آباد کی بربادی پر واقعی خون کے آنسو روئے۔ انگریزوں نے اہالیانِ شہر پر جو ستم ڈھائے، جو سفاکیاں کیں ، داغ کا سینہ اُن سے چھلنی ہے۔''(۱۱(

داغ نے اس ظلم و ستم کا نقشہ کس طرح کھینچا، اس کی تفصیل اُن کی شاعری کے تجزیات میں آگے صفحات میں درج کی جائے گی۔

کچھ عرصہ پریشانی اُٹھانے کے بعد داغ اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۷ء میں را م پور چلے گئے جہاں نواب یوسف علی خاں کی عملی داری تھی۔ داغ نے اُن سے کسی وقت فارسی بھی پڑھی تھی۔ نواب صاحب نے انھیں فرزند نواب کلب علی خاں کا مصاحب مقرر کر دیا۔

اگرچہ رام پور(جسے داغ نے ایک قصیدے میں آرام پور کہا ہے)کے دوران میں دہلی کو یاد بھی بہت کیا لیکن مجموعی طور پر جو صورتِ حال رام پور پہنچ کر داغ نے پہلے مشاعرے میں جو غزل پڑھی وہ اُن کے ذاتی آلام کے ساتھ ساتھ اجتماعی مصائب کی بھی عکاس ہے۔

بھولے بھٹکے جو ترے گھر میں چلے آتے ہیں
اپنی تقدیر کے چکر میں چلے آتے ہیں
داغ جا کر نہ پھرے سوئے عدم اپنے رفیق
ہم یہ سمجھے تھے کہ دم بھر میں چلے آتے ہیں (۱۲(

۱۷/اپریل ۱۸۶۶ء کو انھیں اصطبل اور دیگر کارخانہ جات کی ذمہ داری تفویض ہوئی۔ نیز سرکاری مشاعروں کا انتظام بھی انھی کے پاس تھا۔

رام پور کے قیام کے دوران میں داغ نے خوشحالی کے دن دیکھے اور نواب کلب علی خاں کی وفات تک وہیں سکونت رہی۔

۱۸۷۲ء میں نواب صاحب رام پور نے حج بیت اللہ کے لیے عزمِ سفر کیا۔ جب داغ کو اس ارادے کا پتہ چلا تو نہایت عمدگی سے ساتھ جانے کی تمنا ظاہر کی:

یہ سنا جو حضرتِ داغ نے کہ حضور کعبے کو جائیں گے
یہی ذکر ہے ، یہی فکر ہے ، شب و روز عزمِ سفر سے خوش (۱۳(

غالب نے بھی اپنے ایک شعر میں اِسی تمنا کا اظہار کیا تھا:

غالب گر اِس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی (۱۴(

غالب کی خواہش پوری نہ ہوئی لیکن داغ کی آرزو بر آئی۔ معروضی طور پر اس کے کیا اسباب تھے، یہ الگ سوال ہے لیکن جہاں تک شعر میں تمنا کے اظہار کا تعلق ہے تو نور اللہ محمد نوری نے بجا طور پر لکھا ہے:

''اس کی وجہ اہلِ نفسیات ان دونوں استادوں کے شعروں سے سمجھ سکتے ہیں ۔''(۱۵(

داغ نے دورانِ حج اپنی روحانی سرشاری کو بھی اشعار میں قلم بند کیا اور بعدازاں واپس آ کے کیفیاتِ فراق بھی رقم کیں ۔

یہ ایک امرِ حیرت ہے کہ داغ کے سوانح نگاروں نے مرزا فخرو کے انتقال کے بعد چھوٹی بیگم کے احوال پر کوئی توجہ نہیں کی لہٰذا یہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس عرصے میں کہاں تھیں ۔ تمکین کاظمی نے امتیاز علی خاں عرشی کے حوالہ سے اتنی خبر دی ہے کہ اُن کا انتقال اگست ۱۸۷۹ء کو ہوا۔ وہ لکھتے ہیں :

''ریاست رام پور کے ریکارڈ سے جنابِ عرشی نے داغ کی ایک عرضی برآمد کی ہے جس میں انھوں نے اپنی والدہ کے انتقال کی خبر دی ہے اور نواب صاحب نے مصارفِ تجہیز و تکفین کے لیے رقم منظور کی ہے۔ یہ عرضی ۱۷ شعبان ۱۲۹۶ھ کی مشرحہ ہے جو مطابق ہے ۷ اگست ۱۸۷۹ء کے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اواخر جولائی یا اوائل اگست ۱۸۷۹ء میں چھوٹی بیگم نے رام پور میں داغ ہی کے گھر میں انتقال کیا ہے۔''(۱۶(

رام پور کی ثقافت میں باغِ بے نظیر میں منعقد ہونے والا میلہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جو ہر سال مارچ کے آخری ہفتے میں لگتا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں اسی میلے کے انعقاد کے دوران میں کلکتہ سے آنے والی طوائف منی بائی حجاب پر داغ فریفتہ ہوئے اور اُسے دل دے بیٹھے۔ بعدازاں اُس سے ملنے کلکتہ بھی گئے۔ حجاب سے ملاقات اور کلکتہ کے سفر کی روداد داغ نے اپنی مثنوی ''فریادِ داغ'' میں رقم کی ہے۔ اردو مثنوی کی تاریخ میں اس کی یہ انفرادیت ہے کہ یہ اُن معدودے چند مثنویات میں ہے جن کی بنیاد کسی فرضی قصے پر نہیں رکھی گئی بلکہ حقیقی آپ بیتی ہے۔ نیز یہ ایک منظوم سفر نامہ بھی ہے۔

رام پور میں داغ کی قیام گاہ کے قریب ہی مولانا محمد علی جوہر کا گھر تھا۔ اُس وقت مولانا جوہر کمسن تھے اور اپنے بھائی ذوالفقار خاں کے ساتھ داغ کے گھر جایا کرتے تھے۔ بڑے بھائی اُن کے شاگرد تھے اور ملاقات کرنے جاتے وقت مولاناجوہر کو داغ کے کچھ شعر یاد کرا دیا کرتے تھے۔ جو وہ نہایت کڑک دار لہجے میں سنایا کرتے تھے۔ داغ شعر سن کر نہ صرف ہوتے بلکہ انھیں گود میں اٹھا کر کھلاتے تھے۔ اس صورتِ حال کی روداد مولانا محمد علی جوہر اپنے ایک خط بنام عبدالماجد دریابادی نہایت سرشاری کے ساتھ سناتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

''جنابِ والا! اگر میں اس کے بعد یہ دعویٰ کروں کو شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہو گا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنیے! اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں ، غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نے کی ہو۔''(۱۷(

داغ دہلوی کا رام پور میں قیام نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد صرف چند ماہ رہا کیونکہ نواب صاحب کی وفات کے کونسل کا تقرر ہوا اور جنرل اعظم الدین سے اُن کی نہ بنی اور وہ تمام مال و اسباب کا حساب دے کر دلی واپس آگئے۔

رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغ
مزے سارے تھے وہ خلد آشیاں تک (۱۸(

رام پور سے فراغت کے بعد داغ مختلف شہروں لاہور، امرت سر، کشن کوٹ، اجمیر شریف، آگرہ اور علی گڑھ میں گھومتے رہے۔ یہ شوق سیاحت بھی تھا اور تلاشِ رزق بھی۔ شوق تو بہت حد تک پورا ہوا لیکن رزق کی تلاش ایک مسئلہ رہی اور چند سال قدرے تنگ دستی میں گزرے لیکن ۱۸۹۱ء میں ایک سربہ مہر لفافے نے ان کی قسمت کی گرہ کھولی۔ نظامِ دکن کی غزل برائے اصلاح داغ کو چلی اور استادی شاگردی کا سلسلہ قائم ہوا اور اکتوبر ۱۸۹۱ء میں استادِ شاہ ہونے کا باقاعدہ تقرر ہوا۔

۱۸۹۴ء میں نظام کی سالگرہ کی تقریب میں داغ کو ''بلبلِ ہندوستان''، ''فصیح الملک''، ''جہاں استاد''، ''ناظم یار جنگ'' اور ''دبیر الدولہ'' کے خطابات سے نوازا گیا اور بہت سی مراعات عطا ہوئیں ۔ حیدر آباد دکن میں قیام کے دوران میں رونما ہونے والے دیگر اہم واقعات میں :

۱۔ اقبال کی شاگردی

۲۔ اہلیہ کی وفات

ہیں ۔ اقبال نے داغ کی شاگردی کب اختیار کی۔ اس سلسلے میں دستاویزی یا تحریری ثبوت نہیں ملتے۔ لیکن اقبال کے ابتدائی کلام میں چند اشعار اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ وہ اُن کے شاگرد رہے اور اقبال کی ادبی پرداخت میں داغ نے جو کردار ادا کیا۔ اقبال اس کے معترف تھے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے ''ابتدائی کلامِ اقبال'' میں یہ شعر درج کیا ہے:

جنابِ داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے

ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی ، سخنور بھی (۱۹(

اسی طرح درج ذیل شعر میں بھی اقبال نے نہ صرف اعتراف کا اظہار کیا بلکہ افتخار کا بھی:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اسی پر نہیں نازاں

مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغِ سخنداں کا (۲۰(

اقبال کا یہ سلسلۂ تلمذ بذریعہ خط کتابت تھا۔ اس سلسلے میں خرم علی شفیق کا بیان ہے:

''امتحان انٹرنس پاس کرنے کے بعد اقبال نے جناب نواب فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی استاد حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ سے بذریعہ خط کتابت تلمذ کی ٹھہرائی اور کچھ عرصے تک غزل میں اُن سے اصلاح لیتے رہے۔''(۲۱(

یہ دلچسپ امر ہے کہ داغ کی شاگردی پر صرف استاد ہی کو فخر نہ تھا بلکہ استاد بھی اپنے شاگرد پر نازاں تھے۔ بانگ درا کے دیباچہ نگار لکھتے ہیں :

''مجھے خود دکن میں اُن (داغ) سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات اُن کے زبان سے سنے۔''(۲۲(

کاش قابلِ فخر شاگرد کو اپنے استاد سے خود بھی ملنے کا موقع ملتا لیکن انھیں ملک دکن جانا نصیب نہ ہوا اور دل میں حسرت ہی رہی:

یہی ہے جو شوقِ ملاقاتِ حضرت

تو دیکھیں گے اک بار ملک دکن بھی (۲۳(

داغ کی اہلیہ کا انتقال ۱۸۹۹ء میں ہوا، جس کا داغ کا بہت صدمہ ہوا۔ اس دکھ اور تکلیف کی عکاسی اُن کے متعدد خطوط سے ہوتی ہے۔

اہلیہ کی وفات کے بعد حجاب نے کلکتہ سے آکر اِس خلا کو پُر کرنے کی کچھ مصنوعی کوشش کی لیکن بات نہ بن سکی اور وہ مایوس ہو کر واپس چلی گئی۔ داغ کے گھر میں اُس کے اطوار سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بوڑھے داغ سے نکاح کر کے اُس کی دولت پر ہاتھ صاف کرنا چاہتی تھی۔ اس کا احساس خود داغ کو بھی ہو گیا تھا۔

داغ سے کہتے ہیں سب دے دو مجھے
جو ملا ہے تم کو آصف جاہ سے (۲۴(

داغ کو خون کے دباؤ کا عارضہ تھا۔ صحت کے دیگر مسائل بھی رہتے تھے۔ محققین کے نزدیک اُن کی رنگ سیاہ ہونے کی ایک وجہ اُن کی گوناگوں بیماریاں بھی تھیں ۔ خصوصاً عمر کی آخری دہائیوں میں وہ کچھ زیادہ ہی بیمار رہنے لگے۔ اس کا اندازہ اُن کے اُس زمانے کے خطوط سے بھی ہوتا ہے۔ اُن کی مذکورہ امراض کے باعث وہ ذہنی اور نفسیاتی طور پر بھی خاصے پریشان رہتے تھے۔ لیکن اُن کے لیے ان پریشانیوں سے بڑھ کر اُن کی وہ ذہنی اُلجھن تھی جس کا باعث اُن کے مخالفین تھے۔ داغ ابھی حیات تھے کہ مخالفین نے اُن کے انتقال کی افواہ اڑا دی۔ ''حیاتِ داغ'' کے مصنف کے بقول:

''۱۸۹۵ء میں آپ سخت بیمار ہوئے۔ حاسدوں نے اُن کی موت کی خبر اُڑا دی اور یہ خبر تمام اخباروں میں چھپ کر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئی۔ شاعروں نے قطعاتِ تاریخِ وفات لکھے اور بعض شعرا کے حلقے میں اس بے وقت وفات پر ماتمی جلسے بھی ہوئے۔''(۲۵(

موت برحق ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں لیکن داغ کی ایک تمنا تھی جسے خدا نے پورا کیا۔ تمکین کاظمی لکھتے ہیں :

''داغ ہمیشہ آرزو کرتے تھے کہ خدا حج کے روز موت دے۔ چنانچہ دعا قبول ہوئی اور ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔''(۲۶(

نمازِ جنازہ فرماں روائے دکن کے حکم سے مکہ مسجد میں ادا کی گئی۔ پہلے عیدا لاضحی کی نماز ادا ہوئی جس کے بعد داغ کا جنازہ پڑھایا گیا۔ بعدازاں حضرت یوسف صاحب، حضرت شریف صاحب کے مزار کے پائین میں اُن کی اہلیہ کے ساتھ انھیں دفن کیا گیا۔

داغ کے مراثی، قطعاتِ تاریخ نیز لوحِ مزار پر کندہ کرنے کے لیے اشعارِ متعدد شعرا نے کاوش کی۔ تاہم سائل دہلوی چونکہ اُن کے داماد تھے۔ اسی لیے اُن کے اشعار لوح مزار کی زینت بنے۔ طویل مرثیوں میں حضرت جلیل اور اقبال کے مرثیے خاصی شہرت رکھتے ہیں ۔ داغ کے ایک بدیسی شاگرد ایک آئرش سخنور بی ڈی مانٹروز مضطر (Benjaman Dude Mont Rose Muztar) نے بھی ۱۰۲ بند پر مشتمل بڑا پُراثر مرثیہ تخلیق کیا لیکن اس حوالے سے خود سخن داغ ایک پُر اثر مرثیہ ہے:

خانۂ عشق بے چراغ ہوا
آج راہی جہاں سے داغ ہوا (۲۷(

حوالہ جات:

)۱(داغ دہلوی، گلزارِ داغ، مطبع انوارِ محمدی، لکھنؤ: س ن، ص۱۵۳
)۲(تمکین کاظمی، داغ، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص۲۱
)۳(مالک رام، ماہ نامہ پگڈنڈی، امرت سر، دسمبر ۱۹۶۰ء، ص۵۷
)۴(ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو، (جلد چہارم)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۲ء
)۵(خواجہ محمد زکریا، کلیاتِ داغ،الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۱۹
)۶(داغ دہلوی، ''مکتوب بنام امیرمینائی''، زبانِ داغ،مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۱۱۳-۱۱۴
)۷(مولانا ابوالکلام آزاد، ''فریزر کا قتل اور نواب شمس الدین''، مشمولہ: غالب اور ابوالکلام آزاد، مرتبہ: عتیق صدیقی، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص۱۳۲-۱۳۳
)۸(داغ، ص۲۷
)۹(داغ دہلوی، گلزارِ داغ، ص۷۹
)۱۰(نور اللہ محمد نوری، کتابِ داغ، ناشر نامعلوم، سن ندارد، ص ۴
)۱۱(سبط حسن، افکارِ تازہ، (مرتبہ: سیّد جعفر احمد)، دانیال، کراچی، ص۶۴-۶۵
)۱۲(داغ دہلوی، گلزارِ داغ، ص۱۴۰
)۱۳(ایضاً ، ص۱۱۱
)۱۴(اسد اللہ خاں غالب، دیوانِ غالب، مرتبہ: حامد علی خاں ، الفیصل ، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۱۸۵
)۱۵(کتابِ داغ، ص۶
)۱۶(داغ، ص۶۸
)۱۷(مولانا محمد علی جوہر، کلامِ جوہر ،مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ص۲۳
)۱۸(داغ دہلوی، مہ تابِ داغ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۰ء، (اشاعت دوم)، ص۱۷۵
)۱۹(ڈاکٹر گیان چند، ابتدائی کلامِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۴۷
)۲۰(ایضاً
)۲۱(خرم علی شفیق: اقبال (ابتدائی دور ۱۹۰۷ء تک) ، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۲۲۵
)۲۲ (شیخ عبدالقادر، کلیاتِ اقبال،اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۳ء، (طبع یازدہم)، ص۲۸
)۲۳(ڈاکٹر گیان چند، ابتدائی کلامِ اقبال، ص۸۱

)۲۴(داغ دہلوی، یادگارِ داغ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص۱۸۸
)۲۵(اظہر ہاپوری، حیاتِ داغ، مطبع منشی رام اگروال، لاہور، ۱۹۰۵ء، ص۳۹
)۲۶(داغ، ص۱۸۹
)۲۷(گلزارِ داغ، ص۶

/...../